مسلم پرسنل لا

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں ایک مباحثہ[1]

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس میں اسلامی قانون کے ماہرین بھی دنیا کے مختلف حصوں سے بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ اس لئے اس اہم موقع پر مسلم پرسنل لا (مسلمانوں کے عائلی قوانین) میں تبدیلی کے مسئلے پر سمپوزیم کا انتظام ضرورت اور محل کے لحاظ سے عین مناسب تھا اس سمپوزیم کے صدر مرکزی وزیر تعلیم مسٹر چھاگلا تھے اور سیکرٹری پروفیسر محمد مجیب[2] اس کے خاص مقررین حسب ذیل تھے۔

۱۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی (علی گڑھ)

۲۔ ہز ایکسلنسی مسٹر سیف اللہ اسین (سفیر ترکی)

۳۔ ہز ایکسلنسی مسٹر احمد احسن الفقیہ (سفیر متحدہ عرب جمہوریہ)

---

[1] جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ترجمان ماہنامہ "جامعہ" کا حال میں "مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس نمبر" نکلا ہے۔ یہ کانگرس اوائل جنوری ۱۹۶۴ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ "جامعہ" کے اس نمبر میں کانگرس کی مختصر روئداد شائع ہوئی ہے۔ یہ اقتباسات اس نمبر سے ماخوذ ہیں۔ (مدیر)

[2] صدر شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و ایڈیٹر "برہان" دہلی

۴۔ مسٹر میر اقبال حسین (بنگلور)

۵۔ پروفیسر سید حسن نصر (ایران)

۶۔ پروفیسر اینڈرسن

صدر نے اپنی مختصر افتتاحی تقریر میں اس کی وضاحت کی کہ زیر بحث موضوع کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کا تعلق ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں سے ہے لہٰذا یہ بات صاف ہو جانی چاہیئے کہ پرسنل لا کی کیا حدود ہیں۔ ان معاملات کے علاوہ جن کا تعلق خاص طور پر ذاتی عقیدہ اور اس کے متعلقہ اعمال سے ہے، فرد کی زندگی کے ہر مسئلے کا اثر سماج اور ریاست پر پڑتا ہے۔ ہندوستان سیکولر ریاست ہے اس لئے ان قوانین پر کسی کمیونٹی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیئے جو فلاح عامہ کے پیش نظر وضع کئے جائیں۔ ایسے قوانین اور عدالتی فیصلے پہلے ہی سے موجود ہیں، جن کی بنا پر مسلم پرسنل لا میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے اور آج بھی ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ نقطہ نظر کہ پرسنل لا مقدس ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جا سکتی، صحیح نہیں ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ذاتی عقیدے سے ہے، اس میں کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیئے۔ باقی اور معاملات میں پارلیمنٹ کو یہ طے کرنے کا حق ہے کہ مجموعی طور پر قوم کے حق میں کیا چیز مفید ہے۔

اس ضمن میں چھاگلا صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیکولر ریاست کی پارلیمنٹ انصاف اور عام مفاد کی خاطر ہر قسم کا قانون بنانے کی مجاز ہے۔ صرف عقائد کے معاملے میں اس کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس رائے کو ثابت کرنے کے لئے چھاگلا صاحب نے یہ دلیل دی کہ حکومت معاشی اور سیاسی معاملات سے متعلق قوانین بنانے کی مجاز ہے اور اس سے بہرحال انفرادی حقوق پر اثر پڑتا ہے۔ اور جب کوئی ایسا معاملہ جس کا تعلق ان انفرادی حقوق سے ہو، جو شریعت کے مطابق دیئے گئے ہیں۔ عدالت میں پیش ہوتا ہے، تو جج کا فیصلہ لامحالہ شرعی قانون میں اضافہ یا ترمیم کرتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے دین اور شریعت کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔ انہوں نے امام ابو یوسفؒ کی یہ رائے نقل کی کہ جو شخص اپنے زمانے سے واقف نہیں ہے وہ شریعت کے معاملات میں رائے دینے کا اہل نہیں ہے۔ انہوں نے منصوص اور غیر منصوص کے

فرق کو بھی واضح کیا اور اس کی تائید کی کہ غیر منصوص معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو۔ مولانا کی یہ رائے تھی کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ مولانا نے یہ رائے دی کہ علماء قانونی معاملات میں "اولوالامر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہوسکتا ہے کہ وہ وزارت قانون کے اشتراک عمل سے اس پر غور کریں کہ کن خاص معاملات میں شرعی قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے[1]۔ مولانا اکبرآبادی نے فرمایا کہ دین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، مگر شریعت زمانے اور حالات کے مطابق برابر بدلتی رہتی ہے[2]۔

---

[1] مولانا اکبرآبادی کے نزدیک اسلامی معاشرہ کے لئے قانون بنانے کے مجاز "اولوالامر" ہیں اور اولوالامر کی وضاحت موصوف نے اس طرح کی ہے "اولوالامر سے مراد حکومت اور علماء دونوں ہیں ایک کے پاس نفاذ کی قوت ہے اور دوسرے کے پاس وضع قانون کی اور اصلاح دونوں کے ملنے سے ہی ہوسکتی ہے۔ تنہا کوئی ایک گروہ اس کو انجام نہیں دے سکتا" برہان بابت ماہ اگست ۶۳ء

[2] کن احکام میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور کن میں نہیں۔ اس مسئلے پر مولانا اکبرآبادی نے "برہان" بابت ماہ اگست ۶۳ء کے "نظرات" میں ذرا تفصیل سے بحث کی ہے لکھتے ہیں:۔ "یہ احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کی نسبت نصوص شرعیہ موجود ہیں اور اس بنا پر ان کو فرض، واجب یا حرام و ناجائز کہا جاتا ہے، مثلاً محرمات نکاح و طعام، تقسیم میراث کے قوانین انعقاد و فسخ نکاح کے شرائط و لوازم، یہ تمام احکام قطعی ہیں، اور ان پر ہرگز نظر ثانی نہیں کی جاسکتی۔ ان کے مقابلے میں دوسری قسم کے احکام وہ ہیں جن کی نسبت سرے سے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے۔ یا نص موجود ہے مگر اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حکم فرض، واجب یا حرام نہیں ہے۔ یا نص ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم کسی خاص علت یا سبب یا حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس صورت میں اگر کبھی علت سبب یا حکمت و مصلحت باقی نہ رہے تو حکم خود بخود بدل جائے گا۔ خواہ وہ حکم وقتی و ہنگامی طور پر کیسا ہی لازمی و ضروری ہو۔"

ترکی اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیروں نے اپنے اپنے ملک میں پرسنل لا میں تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ سفیر ترکی نے کہا کہ حالات کے ساتھ یہ تبدیلیاں آئیں۔ ترکی کی نیشنل اسمبلی کی اے کی وہی حیثیت قرار پائی، جو اجماع کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ قرآنی تعلیمات اور انصاف و مساوات کے اصولوں کے مطابق ہوئی ہیں۔ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں پرسنل لا سے متعلق جو قوانین بنائے گئے ہیں، وہ قرآن و سنت کے مطابق ہیں۔ ہم لوگوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ چاروں مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اور شیعہ امامیہ فقہ کے اصولوں کو پیش نظر رکھا اور فلاح عامہ کے اصول کے تحت جہاں جو بات معقول ملی، اسے لے لیا۔ انہوں نے اس کی کئی مثالیں دیں اور ثابت کیا کہ جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ شریعت کے حدود میں ہیں۔

سفیر ترکی اور سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ایک فقہی مذہب کی پابندی کرنے کے بجائے چاروں مذاہب کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے تو بہت سی ضروری اصلاحیں کی جا سکتی ہیں۔ مصر میں چاروں مذاہب کے علاوہ شیعی مذہب کے اصول بھی سامنے رکھے گئے۔ اور اسی طرح یہ معلوم ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے دائرے سے نکلے بغیر ایسے اصولوں کو قانون کی شکل دی جا سکتی ہے، جو انفرادی حقوق کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کر دیں جتنا کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے۔

احمد حسن الفقیہ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ نے بتایا کہ مصر میں اگر کسی عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو جاتا تو بیوی عمر بھر انتظار میں بیٹھی رہتی۔ شوہر کے لئے طلاق دینا اتنا آسان تھا اور خاص حالات کی وجہ سے جو شوہر اس قانونی رعایت سے فائدہ اٹھا رہے تھے، ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ بیوی کے حق کا تحفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ عورتوں میں تعلیم پھیلی تو یہ لازمی بات تھی کہ رائج قانون کے خلاف احتجاج کریں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ان کے طریق زندگی پر اعتراض کرنے والے بہت تھے اور اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح ترکی میں ۱۹۱۱ء سے جو لڑائیاں شروع ہوئیں تو انہوں نے مردوں کی آبادی اتنی کم کر دی کہ اگر عورتیں پردے میں بیٹھی رہیں یا

انہیں وراثت کا اور اپنی جائداد کا خود انتظام کرنے کا حق نہ ملتا تو ترک بالکل تباہ ہو جاتے۔

میرا قبال حسین نے پورے طور پر انصاف و استحسان کے اصول پر تبدیلی کی حمایت کی آپ نے محبوب الارث کے مروجہ قانون کا حوالہ دے کر فرمایا کہ یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہی جاسکتی کہ ایک شخص کے کچھ پوتے مخصوص حالت میں وراثت سے محروم کر دیئے جائیں اور کچھ پورے ترکہ کے مالک قرار پائیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور میرا قبال حسین دونوں نے سوسائٹی کے مفاد میں ایک سے زیادہ شادی پر پابندی لگانے کو حق بجانب اور جائز قرار دیا۔

اسی سیمینار میں سید حسین نصر ایک ایرانی فاضل نے بہت اصرار سے کہا کہ شریعت کو دین اور معاملات دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا جیسے انسان کو جسم اور روح دو حصوں میں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی شریعت جسم اور روح کے اتحاد و اتصال کا نمونہ اور احکام الٰہی کا مجسمہ ہے۔ ہم جن مادی حقائق کو سامنے رکھ کر شریعت کو جانچتے ہیں وہ حقیقت کا صرف ایک رخ ہے۔ ایسا رخ جو بدلتا رہتا ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔ یہ کہنا بھی مہمل ہے کہ قانون کو وقت کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا چاہیئے کیونکہ اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وقت کس کے ساتھ چلتا ہے اور اس کو چلانے والا کون ہے۔ دراصل شریعت کو عقائد اور معاملات دو حصوں میں تقسیم کرنا عیسائیوں کی تقلید میں شروع کیا گیا۔ عیسائی مذہب میں کوئی شریعت نہیں ہے یہ پوری کی پوری رومی قانون سے ماخوذ ہے اس لئے عیسائیوں میں قانون کی حیثیت ضمنی اور اتفاقی ہے اور دراصل اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اب اس بات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ جیسے عیسائی ملکوں نے اپنا قانون بدلا ہے، ویسے ہی وہ بھی اپنی شریعت کو بدلیں۔ یہ مطالبہ یورپ اور امریکہ کی نقل کی خاطر کیا جاتا ہے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم تعدد ازدواج کو برا سمجھیں اس لئے کہ یورپ اور امریکہ میں اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ اور ہم میں احساس کمتری اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہم اسے بلا تامل مان لیتے ہیں۔ عیسائی مذہب کے طریقہ کار اور یورپ و امریکہ کے رواج کی نقل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست اخلاقی حاکم بھی بن جائے گی اور

اس کے مقابلے میں شریعت کیا قرآن کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی لیکن یہ سب کہنے کے بعد سید حسین نصر نے یہ بھی کہا کہ ایران میں علماء کے مشورے سے اور نپولین کے مجموعہ قانون کو سامنے رکھ کر احکام مدنیہ مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی ایران میں اسی طرح انفرادی حقوق میں تبدیلیاں کی گئی ہیں، جیسے کہ ترکی اور مصر میں، اور طریق کار بھی وہی اختیار کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں۔

پروفیسر اینڈرسن نے پروفیسر نصر کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا اور اسلامی ملکوں کے قوانین میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، ان پر بڑی تصریح کے ساتھ روشنی ڈالی اور اس کی حمایت کی کہ فلاح عامہ کے اصول کے تحت اسلامی ملکوں میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہونی چاہئیں۔

"جس کسی منظم ریاست میں قانون بنتے ہیں، تو یہ واضح اور مسلّم ہوتا ہے کہ قانون بنانے یا بنے ہوئے قانون میں تبدیلی کرنے کا اختیار کس کو ہے شرعی قوانین میں تبدیلی کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے مستند ہونے کے بارے میں مسلمان متفق ہوں۔ اجتہاد اور اجماع بحث کی خاطر تو تبدیلی کرنے کے ذریعہ مانے جاسکتے ہیں، لیکن نہ تو اجتہاد کرنے کا حق کسی کو واضح طور پر دیا گیا ہے اور نہ اس کی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ اجماع کی صورت کیا ہو سکتی ہے، اس کا طے کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ علماء کو تمام مسلمانوں کا نمائندہ رسماً یا احتراماً مان لیا جائے، تب بھی یہ معاملہ رسم اور احترام کا ہوگا۔ واضح قانون کا نہ ہوگا۔ ویسے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کل صحیح معنی میں عالم اسی کو مانا جا سکتا ہے، جو صرف دینی علوم میں ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم اور خاص طور پر اجتماعیات اور علم قانون میں ملکہ رکھتا ہو۔ بہ شرط ان لوگوں کو جمع کر کے پوری نہیں کی جاسکتی، جن میں سے کچھ دینی علوم سے اور کچھ دنیاوی علوم سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔"